بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

اِشارات

جن لوگوں نے قرآن اور حدیث کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہیں کہ اسلام کی نگاہ میں اصل اہمیت فرد کی ہے نہ کہ جماعت یا اجتماعی نظام کی۔ ہر ہر فردِ انسانی کو اللہ تعالیٰ نے شخصیت عطا کی ہے، خودی کا احساس دیا ہے، انفرادی خصوصیات بخشی ہیں، دیکھنے کے لیے آنکھیں دی ہیں سننے کے لیے کان دیئے ہیں، سوچنے، سمجھنے اور رائے قائم کرنے کے لیے دل دیا ہے، خواہش، تمیز، ارادے اور فیصلے کی قوتیں دی ہیں، اور اپنی ملکیت میں سے بہت سی چیزیں امانۃً اس کے سپرد کر کے ان پر کے اختیارات اسے عطا کیے ہیں۔ اس بنا پر ایک ایک انسان منفرداً اللہ کا خلیفہ ہے اور خلیفہ ہونے کی حیثیت سے ذمّہ دار اور جواب دہ ہے۔ یہی بات ہے جسے قرآن بار بار دہراتا ہے۔ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ۔ كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنٌ ۔ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۔ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا، لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۔ یہ سب اسی حقیقت کے اعلانات ہیں۔ اور اسی کو اس مشہور حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے کہ اَلَا کلکم راعٍ وکلکم مسئول عن رعیتہ۔ پھر اسی بات کو قرآن آخرت کے ذکر میں بکثرت بیان کرتا ہے کہ اللہ کی عدالت میں ایک ایک انسان انفرادی حیثیت سے اپنا حساب دیگا اور جو کچھ برائی یا بھلائی اس نے دنیا کی زندگی میں کمائی تھی اس کا نتیجہ دیکھے گا۔ یعنی جس طرح شخصیت انفرادی ہے اور ذمّہ داری انفرادی ہے اسی طرح نتیجہ و انجام بھی آخرکار انفرادی ہی ہے اور اس نتیجہ و انجام کے خوب یا زشت ہونے اور خوبی و زشتی کے مختلف مدارج میں سے کسی درجہ پر پہنچنے کا تمام تر انحصار اس پر ہے کہ اس نے دنیا کی زندگی میں کس قسم کی شخصیت اپنے اندر پرورش کی، کن صفات کا اکتساب کیا، کس طرح ان قوتوں سے کام لیا جو اللہ نے اسے دی تھیں، کس طرح اُس

اَمانت میں اپنے اختیارات استعمال کیے جو اللہ نے اسے سونپی تھی، اور اپنی تکمیل کے لیے اُن ذرائع سے کہاں تک فائدہ اٹھایا جو اسے حاصل تھے۔

پس یہ حقیقت ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے فرد کی شخصیت کا ارتقاء اور اس کی ذات کی تکمیل بجائے خود مطلوب ہے۔ دین کا مخاطب فرد ہے، خدا کی عبدیت اور اطاعت کی طرف فرد کو دعوت دی گئی ہے، حقوق اور فرائض فرد پر عاید کیے گئے ہیں، امر و نہی کے احکام فرد کو دیے گئے ہیں، طاعت پہ جزا کی امید فرد کو دلائی گئی ہے اور عصیان پر سزا کی دھمکی بھی فرد ہی کو دی گئی ہے۔ اس نظامِ فکر و عمل میں فرد ہی وہ اصل اکائی ہے جس کو ابتدا میں عامل کی حیثیت سے اور انتہا میں نتیجۂ عمل پانے والے کی حیثیت سے بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اسی کی عقل اور جذبات سے یہ اپیل کرتا ہے، اسی کو اپنی ہدایت و رہنمائی کا مخاطب بناتا ہے، اسی کی فلاح کا طالب ہے اور اسی کو خسران سے بچانا چاہتا ہے۔ اگر فرد اپنی جگہ ناقص رہ جائے اور اپنی شخصیت کو پستی میں گرا دے تو آخری فیصلہ میں اُس جماعت اور اجتماعی نظام کی خوبی اس کے لیے کچھ بھی نافع نہیں ہو سکتی جس سے وہ دنیا میں تعلق رکھتا تھا، بلکہ اگر وہ کسی اچھی جماعت اور صالح اجتماعی نظام سے وابستہ تھا اور پھر اس نے اپنی تکمیلِ ذات اور ارتقاءُ شخصیت کے ان مواقع سے فائدہ نہ اٹھایا جو اسے حاصل تھے تو یہ چیز اس کے خلاف ایک اور قوی دلیل بن جائے گی اور اسے اور زیادہ خسران میں مبتلا کرے گی۔ بخلاف اس کے اگر وہ اپنی کوشش سے اس کمال کو پہنچ جائے جس کو وہ پہنچ سکتا تھا اور اپنی شخصیت کو اتنا بہتر نشو و نما دے جتنا وہ دے سکتا تھا، تو جماعت اور اجتماعی نظام کا فساد اس کی فلاح و نجات میں مانع نہیں ہو سکتا، بلکہ یہ چیز اس کے حق میں ایک دلیل ہوگی کہ اس نے ناموافق حالات میں ترقی کے لیے اتنی کامیاب جدوجہد کی یہی معنی ہیں اس آیت کے جو سورۂ مائدہ میں ارشاد ہوئی ہے کہ علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اھتدیتم۔ اور اس کے عکس کی صحت پر خود اسی آیت کا مضمون دلالت کرتا ہے یعنی یہ کہ لَا ینفعکم من اھتدیٰ اذا ضللتم۔

وصول جس کے ساتھ کسی کمال کے حصول اور کسی شخصیت کے ارتقاء کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ آخر کوئی شخص اس سے کہاں تک پرہیز کر سکتا ہے جب کہ ایک کافرانہ نظامِ سیاست نے کامل تسلط حاصل کر کے پوری پوری قوموں کو کفر اور ظلم اور فساد کی خدمت پر مجبور کر دیا ہو؟ پس فرد کی نجات و فلاح بہت مشکل بلکہ محال ہے اگر اس کی ترقی اور تکمیل کے راستے سے ان موانع کو دور نہ کیا جائے جو ایک بگڑی ہوئی جماعت اور ایک فاسد نظامِ اجتماعی کی بدولت پیدا ہوتے ہیں، اور ایک ایسا صالح اجتماعی نظام نہ قائم کر دیا جائے جو اس تکمیل اور ترقی میں مددگار ہو۔

یہ اس معاملہ کا ایک پہلو ہے۔ اور اسی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ترقی اور تکمیل کا راستہ ہی اجتماعی زندگی کے اندر رکھا ہے نہ کہ اس کے باہر۔ فرد کی وہ امتحان گاہ جس میں اسے اپنی لیاقت یا نالائقی ثابت کرنی ہے۔ اور جس میں کامیابی یا ناکامی ہی پر آخرت میں اس کی فلاح و خسران کا مدار ہے، کسی خلوت کدے یا کسی سنسان جنگل میں واقع نہیں ہے بلکہ حیاتِ اجتماعی کے عین منجدھار میں واقع ہے۔ اس کو اکیلا نہیں رکھا گیا ہے بلکہ دوسرے انسانوں کے ساتھ بیشمار تعلقات کے رشتوں میں باندھ دیا گیا ہے۔ وہ کسی کا بیٹا، کسی کا بھائی، کسی کا شوہر، کسی کا باپ، کسی کا دوست، کسی کا دشمن، کسی کا ہمسایہ، کسی کا اجیر، کسی کا مستاجر، کسی کا حاکم، کسی کا محکوم، کسی کا بائع، کسی کا مشتری، کسی کا امین، کسی کا موتمن بنایا گیا ہے۔ اور اس کا امتحان ہی اس امر میں ہے کہ ان تعلقات میں بندھ کر، ذمہ داریوں اور امانتوں کے بوجھ سے لد کر، خوف اور لالچ، محبت اور غضب، امیدوں اور مایوسیوں کے ماحول میں رہ کر وہ کس طرح اللہ کے عائد کردہ حقوق اور فرائض ادا کرتا ہے، کس طرح اس کے مقرر کردہ حدود پر قائم رہتا ہے، کس طرح خلافت کے اس منصب سے عہدہ برا ہوتا ہے جو اس کے سپرد کیا گیا ہے، کن صفات کا اکتساب کرتا ہے، کن خصوصیات کو اپنے اندر نشوونما دیتا ہے اور اپنی سیرت و کردار کے کیسے نقوش دنیا میں چھوڑ کر جاتا ہے۔ نیکی کا جو تصور اسلام پیش کرتا ہے وہ ہر معنی سے خالی ہو جاتا ہے اگر فرد کو اجتماعی زندگی سے الگ کر دیا جائے۔ جس شخص نے تمدنی تعلقات کے جتنے کم شعبوں میں قدم رکھا ہے اور جتنی کم ذمہ داریاں لی ہیں، اس نے گویا اسی قدر کم پرچوں میں امتحان دیا ہے اور اس لحاظ سے اپنی شخصیت کو اتنے ہی پہلوؤں میں تکمیل کے مواقع سے محروم کر لیا ہے جتنی کہ

میں بھی تغیر آگیا ہے، نقطۂ نظر بھی محدود ہو گیا ہے، اور تزکیۂ نفس کے طریقے بھی اُن طریقوں سے مختلف ہو گئے ہیں جو عہدِ نبوت میں اختیار کیے گئے تھے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ تزکیۂ نفس کے بڑے بڑے ادارے اور سلسلے مدتوں سے قائم ہیں اور انکی برکت سے بڑی بڑی پاکیزہ شخصیتوں کے انسان بھی پیدا ہوتے رہے ہیں، لیکن اس پیمانے کے انسان ابھی تک تیار نہ ہو سکے جو جاہلیت کی راہوں پر دنیا کو چلانے والی زبردست قوتوں کے مقابلہ میں اُٹھیں اور اُن سے زور آزمائی کر کے اسلام کو دنیا کا راہنما و کارفرما دین بنانے کی کوشش کریں۔ اور یہ تو خیر بہت بڑا کام ہے، یہاں تو ایسے انسان بھی فراہم نہ ہو سکے جو کم از کم اتنا ہی کر سکتے کہ اسلام کے دائرۂ نفوذ و اثر میں جاہلیت کی قاہرانہ پیش قدمی کو روک دیتے۔ بڑے بڑے نفوسِ زکیہ موجود تھے اور موجود ہیں جو اپنے علم اور اپنی دیانت، اپنی پرہیزگاری اور اپنی پاکیزہ زندگی کے لیے یقیناً خراجِ تحسین کے مستحق ہیں، لیکن ان نفوس کی موجودگی ہی میں جاہلیت اپنی تلوار سے، اپنے قلم سے، اپنے علوم و فنون سے، اپنی تہذیب اور اپنے تمدن سے نہ صرف دنیا کو بلکہ خود مسلمان ملکوں اور قوموں کو بھی فتح کرتی چلی گئی ہے اور چلی جا رہی ہے۔ آخر اس کمزوری کا کوئی سبب تو ضرور ہے، اور جو سبب بھی ہے اس کی تحقیق میں بے جا عقیدت مانع نہ ہونی چاہیے۔

ہمارے ہاں ایک بڑے گروہ کے نزدیک تزکیۂ نفس کا مقصد یہ رہا ہے کہ اسی زندگی میں مشاہدۂ حق نصیب ہو جائے اور ایمان بالغیب کے مقام سے ترقی کر کے ایمان بالشہادت کی دولت حاصل ہو۔ ظاہر نظر میں یہ ایک بلند ترین اور پاکیزہ ترین مقصد ہے، لیکن قرآن نے کہیں ہم کو یہ تعلیم نہیں دی کہ ہم اسے مقصود قرار دے کر اپنی کوشش اس راہ میں صرف کریں۔ بلکہ اس کے برعکس اگر ہم بطورِ خود اسے مقصود قرار دے بھی لیں تو قرآن ہمیں یقین دلاتا ہے کہ یہ گوہرِ مقصود اس زندگی میں نبی کے سوا کسی کے ہاتھ نہیں آسکتا۔ عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْہِرُ عَلٰی غَیْبِہٖ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّہٗ یَسْلُکُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْہِ وَمِنْ خَلْفِہٖ رَصَدًا لِّیَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّہِمْ (یعنی حقائق غیب کا جاننے والا اللہ ہے اور وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا بجز اس رسول کے جس کو اُس نے خود منتخب کیا ہو، پھر وہ اس کے آگے اور پیچھے نگرانی

نگرانی کرنے والے فرشتے لگا دیتا ہے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ان رسولوں نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیئے) اس سے معلوم ہوا کہ پردۂ غیب میں چھپی ہوئی حقیقتوں، یا بالفاظِ دیگر مابعد الطبیعی حقیقتوں کے مشاہدہ کی کوشش فضول بھی ہے، غلط بھی اور اس کے کامیاب ہونے کا بھی امکان نہیں ہے۔ انسان کو ان حقائق کے جتنے اور جس قدر علم کی ضرورت تھی اللہ نے وہ علم اپنے رسولوں کے ذریعہ سے دے دیا ہے اور یہ اللہ کا بڑا احسان ہے کہ اس طرح اُس نے انسان کو ان چیزوں کی تلاش و جستجو کی زحمت سے بچا دیا۔ اب انسان کا کام صرف یہ ہے کہ وہ رسولوں کے دیئے ہوئے علم پر ایمان بالغیب لائے اور جو خدمات اس کے سپرد کی گئی ہیں انہیں اطمینان کے ساتھ انجام دینے میں لگا رہے۔ لیکن اگر اس پر بھی کوئی شخص خواہ مخواہ یہ زحمت اٹھانا ہی چاہے تو اس کی حیثیت خدا کے بلائے ہوئے مہمان کی نہ ہوگی کہ اس کے لیے دروازے کھولے جائیں اور پردے اٹھائے جائیں، بلکہ اس کی حیثیت ایک نقب زن کی سی ہوگی جو خود روزن بنا کر اندر جھانکنا چاہتا ہو۔ سو اللہ کے حرم میں اس نقب زنی کی کوشش ظاہر ہے کہ کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اگر بالفرض کوئی اُس حرم کی سرحد کے قریب پہنچ بھی گیا تو رسولوں کے لیے حفاظت و نگہبانی کا جو غیر معمولی انتظام کیا جاتا ہے اس سے تو وہ بہرحال محروم ہی ہوگا اس لیے وہ جو تھوڑی بہت حقیقت کی جھلک دیکھے گا اُس میں نفس کی غلط فہمیوں، نظر کے دھوکوں اور شیاطین کی دراندازیوں کے بے شمار خطرات ہونگے جن کی بدولت عجب نہیں کہ ایمان بالشہادت کی نعمت پانے کے بجائے ایمان بالغیب کی دولت سے بھی ہاتھ دھونا پڑ جائے۔

اس سے فروتر [illegible] مقصد بتایا جاتا ہے وہ روحانی ترقی ہے، مگر یہ "روحانی ترقی" کچھ ایسی مبہم اور پُراسرار چیز ہے کہ تمام عمر اس کی بھول بھلیاں میں گشت لگانے کے بعد بھی آدمی کو کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کس مقام پر پہنچا۔ اسکی اصطلاحیں، اس کی منزلیں، اسکے ثمرات و نتائج سب مرموز ہیں جن کو ہم جیسے عامی کچھ نہیں سمجھ سکتے۔ ہاں اگر کچھ نظر آتا ہے تو وہ صرف یہ کہ اس راہ میں جو منزلیں طے کی جاتی ہیں ان میں وہ منزل کبھی نہیں آتی جسے بلالؓ اور عمارؓ اور صہیبؓ نے طے کیا تھا اور نہ وہی منزل کبھی آنے کی توقع کی جا سکتی ہے جس کو ابوبکرؓ و عمرؓ نے طے کیا۔

اسلام کے مقصد سے قریب ترین مقصد اُن لوگوں کا ہے جو تزکیۂ نفس سے تقوٰی کا حصول چاہتے ہیں

(باقی صفحہ ۱۳۲ پر)